© rasailojaraid.com

قسط: ۹

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

دہلی قیام میری زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ دارالحکومت' برطانوی استعمار کے چل چلاؤ کا دور، سیاسی سرگرمیوں کا عروج، ملک کے مقتدر سیاسی رہنماؤں کا خطاب، جلسے جلوس آزاد ہند فوج کی رہائی، ایٹم بم کے بعد جاپان کا اپنی شکست کا اعتراف۔ اس پر برطانوی حکومت کی طرف سے جشن فتح کا پروگرام اور عوام کا اس پر ردِ عمل، مجلس احرارِ اسلام کے مرکزی رہنماؤں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے پاس بیٹھنے کے مواقع، مجلس احرارِ اسلام دہلی کی سرگرمیاں، رہنماؤں کی خطابات سننے کے مواقع اور اس طرح کے کئی واقعات وحالات کا تعلق میری زندگی کے اسی حصے سے متعلق ہے۔ غرضیکہ جو کچھ میں نے قیام دہلی کے دوران دیکھا اور سنا میری سیاسی تربیت اور میرے سیاسی شعور میں گراں قدر اضافے کا باعث بنا اور اس کے ساتھ انگریزی سلطنت کے خلاف میرا جذبۂ نفرت اپنے عروج کو پہنچا۔ قیام دہلی کے دوران ہی میں نے انگریزی استبداد، انگریزی کرّ وفر، انگریزی شان وشوکت کو عوام کے جذبۂ آزادی کے سامنے سرنگوں ہوتے دیکھا۔ جس نے میرے تن بدن میں مسرت وانبساط کی ایک لہر دوڑادی اور میرے جذبۂ حُریّت پرستی اور سامراج دشمنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اور یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی ہندوستان کے آزادی پسندوں کا جہادِ حُریّت اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔

سکول میں داخلہ:

۱۹۴۵ء کا آخر تھا یا پھر ۱۹۴۶ء کا آغاز ہم دہلی پہنچے۔ قبلہ والد محترم نذیر مجیدی کا وہاں کاروبار تھا۔ انہوں نے ہمیں بھی بلوالیا۔ ہم ''چاندنی چوک'' اور ''بلّی ماراں'' کے سنگم پر واقع ایک مکان میں مقیم ہوئے جہاں سے ایک طرف تو چاندنی چوک کا بازار نظر آتا تھا تو ہماری دوسری طرف بلّی ماراں کا بازار تھا۔ ہمارے مکان سے ''فتح پوری'' مسجد چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ فتح پوری مسجد کے ساتھ ہی فتح پوری مسلم ہائی سکول تھا جس میں مجھے ساتویں جماعت میں داخلہ ملا۔ ان دنوں مجھ پر مجلس احرار اسلام کا جنوں اپنے جوبن پر تھا۔ میرا اسکول اور اس کے گردونواح کا پورا علاقہ مسلم لیگ کا گڑھ تھا۔ فتح پوری مسجد میں نماز جمعہ مسلم لیگ کے پرچموں تلے ادا ہوتی تھی۔ جس سکول میں مجھے داخلہ ملا اس علاقے میں تھا جسے مسلم لیگ کا گڑھ کہا جاتا تھا۔ لڑکوں کی اکثریت مسلم لیگی تھی۔ میں نے بھی باوجود اس ساری صورت حالات کے جب پہلے دن سرخ قمیص پہن کر سکول جانے کی ٹھانی تو قبلہ والد صاحب نے مجھے روکا اور کہا کہ ''وہاں سکول میں سارے لڑکے لیگی ہوں گے وہ تمہیں تنگ کریں گے'' لیکن میں نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلے دن تو سرخ قمیص کی وجہ سے ہر لڑکے نے مجھے روک کر میری سرخ قمیص کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا ''ابے تو احراری ہے کیا؟'' میں نے سینہ چوڑا کر کہ ہر پوچھنے والے لڑکے کو جواب میں کہا ''ہاں میں احراری ہوں'' دوسرے دن چھٹی کے بعد ان لیگی لڑکوں نے اکٹھے ہو مجھے گھیرا اور میری پٹائی کر دی۔ میں اکیلا وہ بے شمار۔ اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر روز ان کا یہ معمول ہوگیا۔ تعداد میں کثرت کی وجہ سے پلڑا ان کا ہی بھاری رہتا۔ اگر چہ میں بھی اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ تو مدافعت کرتا لیکن مجھے احساس تھا کہ والد صاحب نے درست کہا تھا مجھ سے غلطی ہوئی۔ تاہم اب کیا ہوسکتا تھا۔ میرے ذہن میں اس مشکل سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک منصوبہ تھا۔ ایک دن اسی منصوبے کے تحت ان لیگی لڑکوں کو جوش دلا کر میں اپنے ہمراہ اپنے گھر تک لے آیا جو سکول سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ انہیں کہا یہاں ٹھہرو، اوپر گیا تو چچا جان کو کہا کہ لڑکے جو مجھے مارتے ہیں نیچے کھڑے ہیں۔ چچا جان غصے میں نیچے اترے اور لڑکوں کو للکارا۔ چچا جان اُس وقت ٹھیٹھ پنجابی لباس میں تھے۔ سلیپر، تہمد، لمبے بال سفید دیسی ململ کا کرتا۔ لڑکے ان کو دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دوسرے دن سکول میں انہیں ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''اس احراری کے پاس بدمعاش ہے۔ اس کے قریب مت جائیو نہیں تو یہ اس بدمعاش سے ہمیں مروا دے گا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے اللہ کی قسم اس بدمعاش کو خود دیکھا ہے۔''

دراصل جس لباس میں لڑکوں نے چچا جان کو دیکھا تھا۔ وہ عموماً دہلی میں بدمعاش ہی پہنتے تھے اور دہلی کے لوگ بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ اللہ نے اس طرح میری مدد کی اور اب اسی سکول میں میرا رعب تھا۔ کوئی لڑکا میرے در پئے آزار ہونے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔

سرخ ہلالی پرچم:

دہلی میں مکان میں ٹھہرتے ہی ہم نے اپنے مکان پر مجلس احرارِ اسلام کے دو پرچم لہرا دیے۔ ایک چاندنی چوک کی طرف تو دوسرا بلّی ماراں کی طرف۔ ہر جمعہ کو ہم شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کے لیے جاتے۔ ہم تینوں بھائی بلّی ماراں سے ''چاوڑی بازار'' پیدل چلتے ہوئے جامع مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو شاہی مسجد میں مجلس احرار کا ایک پرچم ہال میں مسجد کے منبر کے قریب اور دوسرا پرچم مسجد کے صحن میں تالاب کے قریب لہراتا نظر آتا۔ یہ تاثر عام تھا کہ اس علاقے میں مجلس احرار اسلام کے حامیوں کی اکثریت ہے۔ مجلس احرار کے تمام جلسے بھی شاہی مسجد دہلی میں ہی ہوا کرتے تھے۔ شورش کاشمیری کو پہلی دفعہ میں نے اسی مسجد میں دیکھا اور سنا۔ میرے خیال میں وہ ۱۹۳۹ء میں ۷ سال کی قید کاٹ کر جو رہا ہوئے تو سب سے پہلے دہلی تشریف لائے۔ ان دنوں دہلی میں سب احرار رہنما اکٹھے تھے۔ اسی مسجد میں ایک جلسہ میں سب سے پہلے امیرِ شریعت رحمہ اللہ نے خطاب فرمایا۔ ملکی سیاست کے حوالے سے مجلس احرارِ اسلام کے مؤقف کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ آپ نے اپنی تقریر کے بعد شورش کو بلایا۔ جو اس وقت مسجد کے ہال میں محراب کے قریب بیٹھے امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی تقریر سن رہے تھے۔ لیکن شورش، شاہ جی کے بعد تقریر کرنے سے انکار کرتے رہے شاہ جی کے شدید اصرار پر سٹیج پر آئے اور تقریر بھی کی۔ یہ شورش کاشمیری کی پہلی تقریر تھی جو میں نے اپنی زندگی میں سنی۔ لیکن اس وقت کا شورش جسمانی لحاظ سے وہ نہیں تھا جو ہم نے پاکستان بن جانے کے بعد دیکھا۔ دبلا پتلا، دراز قامت، کھدر کے لباس میں سر سے پا تک ملبوس، عجیب وغریب دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے کو کھدر کے لباس نے اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔

آزاد ہند فوج کی رہائی اور مجلس احرار کا استقبال:

پھر جب آزاد ہند فوج لال قلعہ سے رہا ہوئی تو اس فوج کے جوانوں نے دہلی کے بازاروں میں اپنی پھٹی پرانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وردیوں کے ساتھ مارچ کیا۔ آزادی اور سبھاش چندر بوس کے نعرے فضا میں بلند ہوئے۔ ایک عجیب سماں تھا۔ وہ جدھر سے بھی گزرتے لوگ سراپا عقیدت ہو جاتے تھے۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی جوش و خروش کی مثال، اطمینانِ قلب، عزمِ راسخ کی تصویر بنے قدم سے قدم ملا کر مارچ کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ان کے قدم سے قدم ملاتے پریڈ میں شامل تھا۔ وہ جدھر جاتے میں بھی ان کے ساتھ قدم ملاتا نعرے لگاتے چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں سے گزرے لیکن وہ جہاں جہاں سے بھی گزرے میں اُن کے ہمراہ تھا۔ ایک عجیب و غریب قسم کی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ اس کیفیت میں ایک انتہائی غصّہ تھا جس کے دھارے میں ہم بہتے چلے جا رہے تھے۔ آزادیٔ وطن کی آرزو جس کا شعور جماعتِ احرار کے ساتھ وابستگی نے میرے دل میں پیدا کر دیا تھا پوری ہوتی نظر آنے لگی تھی۔

آزاد ہند فوج کی رہائی کے بعد ایک بہت بڑا اجتماع کانگریس کے زیرِ اہتمام دہلی کے گاندھی گارڈن میں دیکھا۔ تاحدِ نگاہ انسان ہی انسان تھے۔ حریت پسند، ہندو، مسلم، سکھ سارے ہی اس اجتماع میں موجود تھے۔ آزاد ہند فوج کے تینوں جرنیل، جنرل شاہنواز، جنرل سہگل اور جنرل ڈھلوں سٹیج پر بیٹھے لوگوں کی آنکھوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ بار بار آزادی کے نعرے فضا میں بلند ہوتے ہوئے انگریزی سطوت و شوکت کا منہ چڑا رہے تھے۔ دہلی کی فضا ان فلک شگاف نعروں سے گونج گونج جاتی تھی اور میں بھی اس عظیم اجتماع میں شریک تھا۔ اور اس خوش کن فضا سے اپنے دل و دماغ منوّر ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

انھی دنوں مجلس احرارِ اسلام دہلی کے رضا کاروں نے بھی آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز کو شاہی مسجد کے سامنے ننگی تلواروں سے سلامی دی۔ سلامی کے بعد جنرل شاہنواز نے دہلی کی اس شاہی مسجد میں مجلس احرارِ اسلام کی دعوت پر اپنی آزادی کے بعد پہلی تقریر کی تھی۔ میں اس جلسے میں بھی شریک تھا۔ جنرل شاہنواز ایک جاذب نظر شخصیت تھی۔ دیکھنے والا بس انھیں دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ جوانی اپنے جوبن پر تھی چہرے کی رعنائی نے ان کی شخصیت کو دلکش و دلرُبا بنا دیا تھا۔ نگاہوں سے عقابی عزائم کی جھلک اندازِ تقریر میں بے باکی اور بے خوفی برطانوی سطوت و شوکت کا منہ چڑاتی نظر آتی تھی۔ تقریر کیا تھا معلوم ہوتا تھی کہ کوئی مردِ مجاہد میدانِ جہاد میں جذبۂ حریت سے سرشار اپنے دونوں ہاتھوں سے شمشیر زنی کے جوہر دکھا رہا ہے انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا تھا

غازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تیغ لندن تک چلے گی اہل ہندوستان کی

آزاد ہند فوج کے اس جنرل نے تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ”ہمارے خلاف یہ ایک محض پروپیگنڈہ ہے کہ ہم کانگریس کے ایجنٹ ہیں۔ ہم فقط انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے میں ہندوؤں کے ساتھ ہیں۔ اگر کبھی حالات کا بہاؤ ہمیں اس مقام تک لے گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہندوؤں سے لڑنا ضروری ہوا تو جس دلجمعی کے ساتھ آج ہم انگریزوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اسی طرح ہم کانگریس کے خلاف آپ کو لڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں بعد میں ہندوستانی۔“

اس جلسے کے بعد احرار رضا کاروں کے خلاف مقدمات بھی بنائے گئے کہ انہوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہوئے ننگی تلواروں سے جنرل شاہنواز کو سلامی دی۔ اس کے اعزاز میں جلوس نکالا اور جلسہ کیا۔ بہر حال یہ کھیل تو احرار رضا کار ایک مدت سے کھیلتے ہی چلے آ رہے تھی ان کے لیے یہ کوئی نیا مشغلہ نہ تھا۔

ضیغمِ احرار شیخ حسام الدین رحمہ اللہ سے پہلی ملاقات:

جامع مسجد کے جنوری دروازے کے سامنے سڑک کے اس طرف تمام سیاسی جماعتوں کے دفاتر تھے۔ ہر جماعت کا اس کے دفتر پر لہراتا پرچم ایک عجیب منظر پیش کرتا تھا۔ مجلس احرار اسلام دہلی کا مرکزی دفتر بھی انہی جماعتوں کے دفتروں کے درمیان تھا ایک دن میں اپنی سرخ وردی میں ملبوس اسی دفتر میں اکیلا بیٹھا تھا کہ ضیغمِ احرار شیخ حسام الدین تشریف لے آئے۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شیخ حسام الدین ہیں۔ انہوں نے قریب آ کر مجھے سلام کیا اور خود اپنا تعارف کرایا۔ نہایت نرم اور دھیمے لہجے میں فرمایا ''مجھے حسّام الدین کہتے ہیں'' میں سراپا عقیدت اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تو انھوں نے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا۔ میں انھیں اپنے قریب پا کر نہایت خوش تھا کیونکہ وہ بھی اُن شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کے زندہ باد کے نعرے عموماً ہم لگایا کرتے تھے۔ یہ ان سے پہلی ملاقات تھی وہ کچھ اس طرح ملے کہ جیسے وہ مجھ سے کم تر ہوں ان کی عجز و انکساری بھرے اندازِ گفتگو سے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ شاید مجھ سے کم تر مرتبے کے ہوں وہ مجھ سے مرعوب نظر آئے یہی وہ ان کا انداز تھا جو ان کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی کا وقیع تأثر بن کر میرے دل ودماغ میں ایسا اترا کہ آج جب ان سے جدا ہوئے مدت گزر گئی ویسے ہی میرے دل کے اندر موجود ہے اور مرتے دم تک موجود رہے گا۔ لیکن بعد میں جب انہیں دہلی میں منعقد ہونے والے جلسوں میں دیکھا اور سنا تو ان کی تقریروں کی گھن گرج سے دہلی کے در و دیوار لرزتے ہوئے دکھائی دیے۔ انگریزی سامراج کے خلاف ایک للکار جو زمین سے آسمان تک کی فضا میں ایک ہلچل اور ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ ایسے میں اکثر یہی سوچتا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو مجھے دفتر احرار میں ملا تھا۔ اپنوں کے لیے وہ نرمی اور کفر کے لیے اس بلا کی سختی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

امیر شریعت رحمہ اللہ کی محفل آرائیاں:

محلّہ بلّی ماراں کے عقب میں مشرق کی جانب ایک بہت ہی مشہور کوچہ ''کوچۂ رحمان'' ہے۔ جس میں ایک بہت بڑے مکان میں تمام احرار رہنما قیام پذیر تھے۔ یہیں امیرِ شریعت بھی تشریف فرما تھے۔ میں اکثر چھٹی کے بعد گھر پہ بستہ رکھ کر ان کے پاس چلا آتا تھا۔ اور اکابر احرار کی گفتگو سے لطف اندوز اور مستفید ہوتا تھا۔ امیرِ شریعت اب مجھے شبیر بیٹا کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ ہر روز کی یہ اُن سے ملاقاتیں مجھے اُن کے بہت قریب لے آئیں۔ میں اُن کی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پکڑ کر کھڑا ہو کر اُن کے جسم کو دبایا کرتا تھا۔ اس دوران وہ اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے مجھے محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن ٹانگیں دباتے ہوئے اچانک میرا پاؤں اُن کے پیٹ پر پڑا تو مسکرا کر فرمانے لگے ''یوں نہیں بیٹا، چوری وار کرتے ہو۔ چوری وار کرنا مردوں کا شیوہ نہیں مرد تو للکار کر حملہ آور ہوتے ہیں۔''

مجھے فرمانے لگے اب میرے پیٹ کر پاؤں رکھو۔ میں نے تعمیل ارشاد میں جب اپنا پاؤں اُن کے پیٹ پہ رکھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس دوران انہوں نے اتنا پھلا لیا تھا کہ میرے پاؤں رکھنے کے باوجود مجھ سے نیچے نہ دبایا جا سکا۔ پھر اُنہوں نے مجھے دوسرا پاؤں بھی اپنے پیٹ پر رکھنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنا دوسرا پاؤں بھی رکھ دیا لیکن ان کا پیٹ مجھ سے نیچے نہ دب سکا تو ہنس دیے اور دیر تک میرے ساتھ باتوں میں مصروف رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ میرے لیے میری دل جوئی کے لیے کرتے تھے انہیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ لڑکا صرف میری محبت میں روز مجھ سے ملنے آتا ہے۔ لہٰذا اس کی محبت کا جواب محبت میں ہی ملنا چاہیے یہ ان کا مزاج تھا کہ وہ اپنے مخاطب کی عمر کے مطابق اس سے ہم کلام ہوتے تھے۔

اس دوران انہیں یہ خیال مانع نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ محسوس ہونے دیتے تھے کہ وہ کتنے بڑے انسان ہیں۔ میں نے اکثر و بیشتر ان کی مجالس میں دیکھا کہ جب بھی ان کی محفل میں کوئی کم سن بچہ آجاتا تو وہ اس کی ذہنی سطح پر آجاتے تھے اور بچے کو یہ تاثر دیتے کہ وہ خود بھی اس جیسے بچے ہی ہیں۔ بچے کے محفل میں آنے پر وہ دوسرے لوگوں سے توجہ ہٹا کر آنے والے بچے کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات تو چھوٹے بچوں کے ساتھ توتلی زبان میں بھی باتیں کرتے اور اس کا دل بہلاتے تھے۔ ان کی بچوں کے ساتھ یہ باتیں ایسی پیاری ہوتی تھیں کہ محفل میں بیٹھا ہوا ہر فرد ان باتوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اگر اسی محفل میں کوئی عالم دین آجاتا تو حضرت شاہ جی کی اپنی علمی شان ظاہر ہوتی۔ اب سیرت، فقہ، حدیث، قرآن اور تفسیر موضوع گفتگو بن جاتے۔ امیرِ شریعت کو کئی مفسرین اور مترجمینِ قرآن کے تراجم ازبر تھے۔ وہ ایک آیت کا ترجمہ مختلف مترجمین کے حوالوں سے بیان کرتے تھے اور ہر ترجمہ کا تقابل کرتے ہوئے اپنی ترجیح کا اظہار کرتے۔ بڑے بڑے علماء حضرات آپ کی اس نوعیت کی گفتگو پر ہمیشہ داد دیتے اور آپ کے نوادرِ فکر کو اپنے لیے سرمۂ چشم قرار دیتے۔ اب بھی میں اکثر سوچتا ہوں یہ سب کچھ ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا جو یہ کہتے تھے کہ ”میں نے تو اپنی کتابوں کی گرد جھاڑ کر نہیں دیکھی۔“ لیکن دوسری طرف قرآن پاک کی جو تشریحات فرماتے اکابر علماء اس پر بے ساختہ اش اش کر اٹھتے۔ آپ کی محفلوں کا عجیب رنگ ہوتا تھا۔ جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ اگر آپ کی محفل میں کوئی شاعر آجاتا تو عطاء اللہ شاہ بخاری ایک بہت بڑے شاعر کے طور پر ان کے سامنے ہوتے۔ نظم، غزل، قطعہ، دوہا، رباعی، نعت، منقبت۔ غرضیکہ شاعری کی وہ کونسی صنف ہے جو زیر بحث نہ آتی اور سننے والے اس سے لطف اندوز نہ ہوتے علم و ادب کا ایک خوبصورت نگار خانہ جاتا تھا۔ دیکھنے اور سننے والا حیران و ششدر رہ جاتا کہ امیرِ شریعت ادب کے میدان میں بھی ایسی مہارت تامہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر آپ کی ادبی نکتہ آفرینیوں پر سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ میں نے شاہ جی کو شعراء کا کلام سنتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور شعراء کو اپنا کلام سناتے ہوئے بھی۔ بڑے بڑے شاعر ان کے سامنے کلام سناتے تو ایک عجیب کیفیت میں محو ہو جاتے تھے۔ امیر شریعت کچھ ایسے انوکھے انداز سے داد دیتے کہ شاعر تڑپ اٹھتا اور اپنے آپ کو زمین سے اٹھ کر آسمان پر تیرتا محسوس کرتا تھا۔ کبھی اچھے شعر پر آپ کی گفتگو طویل بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اور شاعر کو یہ کہتے کہ آپ کا یہ شعر بہت ہی عمدہ ہے۔ غالب نے بھی اسی مفہوم کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح ادا کیا ہے لیکن جو بات نظیری کے اس شعر میں ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی۔ فارسی شعراء میں غالب اور اقبال کے ساتھ ساتھ حافظ، فردوسی اور بیدل کے سیکڑوں شعر انہیں ازبر تھے۔ آپ شعر کہتے تو سننے والا حیرت میں ڈوب ڈوب جاتا۔ شعر کے ہر ہر لفظ کی معنویت کے صوتی تقاضوں کو جس انداز میں وہ پورا کرتے خود شعراء حضرات اس پر تعجب کا اظہار کرتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ شعر کہنے سے شعر پڑھنا زیادہ مشکل کام ہے ان کی محفل میں جب شعر و شاعری کی باتیں ہوتیں تو اہل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محفل حیران رہ جاتے کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو تھوڑی دیر پہلے فقہ، حدیث اور تفسیر پر علماء حضرات سے بات کر رہا تھا۔

ایک دفعہ فیصل آباد میں مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر شاہ جی محلّہ گورونانک پورہ کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ مشہور شاعر حافظ لدھیانوی تشریف لائے آپ ان کی آمد پر بڑے خوش ہوئے انہیں اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی کہ حافظ بیٹھے کچھ سناؤ۔ حافظ لدھیانوی آپ کو اپنا کلام سناتے رہے اور شاہ جی اپنے انداز میں انہیں داد دیتے رہے۔ اتفاقاً میں اور حافظ صاحب ایک ہی وقت میں شاہ جی کی اس پُر لطف محفل سے اٹھ کر باہر آئے تو میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہنے لگے:

”نہ جانے یہ کیا شخصیت ہے کہ ہر انسان کو مبہوت کر دیتی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہاں بیٹھے اور کیا کر رہے ہیں۔ شعر کو سمجھنا اور شعر پر داد دینا تو شاہ جی پر ہی ختم ہے۔ ان کی داد پر شاعر کو اپنی شاعری پر ناز ہونا لگتا ہے۔“

کوچۂ رحمان دہلی کے اس مکان میں جس کا تذکرہ ابتداء میں ہو رہا تھا میں نے امیرِ شریعت اور علامہ انور صابری کو آمنے سامنے بیٹھے شعر سنتے اور کہتے دیکھا ہے۔ علاّمہ انور صابری اپنے سامنے سگریٹوں کا ایک ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔ کاغذ آپ کے سامنے دھرا تھا اور کش پہ کش لگاتے ہوئے شعر پہ شعر لکھتے جا رہے تھے۔ شاہ جی ان کے سامنے بیٹھے ان کے یہ شعر سن رہے تھے اور داد بھی دیے جا رہے تھے۔ ارد گرد تمام احرار رہنما اور دوسرے لوگ بھی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھے اس دن پتہ چلا کہ انور صابری شعر کس طرح کہتے ہیں۔ ان کے دماغ گویا کوئی شعر ساز فیکٹری ہے جس میں شعر ڈھل ڈھل کر ان کی زبان پر آ رہے ہیں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو شعر گوئی جیسے مشکل فن پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ گویا شعر کہنا ان کے لیے کوئی کام ہی نہیں۔

شعر گوئی اور شعر فہمی سے حضرت امیر شریعت کو ایک فطری لگاؤ تھا۔ تقریر کے دوران شعر پڑھنا کوئی ان سے سیکھے یوں محسوس ہوتا کہ شاعر نے یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ فیصل آباد جو اس وقت لائل پور تھا ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں سکھر جیل سے ایک سال قید کے بعد رہا ہو کر آئے تھے۔ پیپلز کالونی میں جو اس وقت زیرِ تعمیر تھی تقریر کے دوران سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس بیان پر تنقید کرتے جو انہوں نے منیر انکوائری کمیشن کے سامنے دیا تھا جو کچھ اس طرح تھا کہ:

”میں نے تو انہیں (مجلس عمل والوں) کو منع کیا تھا کہ تحریک نہ چلائی جائے لیکن انہوں نہ میری مانی ہی نہیں۔ میں تحریک کے حق میں نہیں تھا۔ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو سڑک کے کنارے چلا جا رہا ہو اور ایک ٹرک پیچھے سے آئے اور اسے اپنی لپیٹ میں لے کر اسے کچلتا ہوا گزر جائے۔“

شاہ جی اپنی اس پر کہا کہ جس وقت ہے، ہم نے مجلس عمل کے تحت تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مودودی صاحب اس فیصلہ میں شریک تھے یوں ان کے گھٹنے کے ساتھ میرا گھٹنا تھا۔ وہ میرے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شریکِ مشورہ تھے۔ اب اس بات سے وہ اگر مکر گئے ہیں تو ہم کیا کریں۔ اس پر آپ نے ایک شعر بھی پڑھا تھا

حضرتِ ناصح نے مے پی کے اچھی چال کی
محتسب سے جا ملے رندوں کے مخبر ہو گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غالب کے اشعار آپ کو خاص طور پر پسند تھے۔ اکثر و بیشتر اپنی تقاریر میں پڑھتے اور اس انداز سے کہ سامعین پر سحر طاری ہو جاتا اور سننے والوں کے دل و دماغ جھوم جھوم اٹھتے۔

پُل بنگش جناح پارک کا تاریخی جلسہ:

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک عرصہ تک ان دنوں احرار رہنماؤں کے ساتھ دہلی میں مقیم رہے روزانہ کسی نہ کسی جگہ پر مجلس احرارِ اسلام اور جمعیت علماء ہند کا ایک مشترکہ جلسہ ہوتا تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے۔ ان جلسوں میں بھی ایک احرار رضا کار کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی جلسے میں احرار رضا کاروں نے لیگی فتنہ پرداز نعرے بازوں کی پٹائی بھی کی۔ یہ جلسہ مسلم لیگ کے گڑھ ''پُل بنگش'' جناح پارک میں ہوا تھا۔ ایک مسجد کے سامنے ایک بڑا وسیع میدان تھا جسے پنڈال کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف کچی دیواریں تھیں۔ ان دیواروں کے ساتھ چاروں طرف احرار رضا کار سرخ وردیوں میں ملبوس اپنی اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میری ڈیوٹی مسجد کی چھت پر لاؤڈ سپیکر کے ایک مائیک پر لگائی گئی میں چونکہ بلندی پر تھا اس لیے پوری جلسہ گاہ میرے سامنے تھی اور میں ایک بڑی اچھی جگہ سے پورے جلسہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس جلسے سے شورش کاشمیری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کے علاوہ امیرِ شریعت نے بھی خطاب کیا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کو پہلی دفعہ اس جلسہ میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ تقریر کیا تھی کہ آج تک اس کی گونج میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ بڑے ہی تیز بولنے والے مقرر تھے۔ صاحبزادہ فیض الحسن کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ احرار رہنماؤں میں سب سے تیز بولنے والے مقرر تھے۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کے مقابلے میں وہ بھی ماند نظر آئے۔ الفاظ آپ کی زبان سے اتنی تیزی اور تسلسل کے ساتھ نکلتے تھے کہ جیسے کوئی مشین گن گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی ہو۔ مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ کو بھی پہلی دفعہ اس جلسے میں سنا اور دیکھا۔ کیا خوبصورت چہرہ تھا۔ شرافت اور متانت کی بولتی ہوئی تصویر تھے۔ جلسے کے ارد گرد مسلم لیگی بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ جو مخالفانہ نعرے بازی کر رہے تھے جس کی وجہ سے مقررین کو تقریر کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ مولانا احمد سعید اور مولانا حفظ الرحمٰن نے انہی حالات میں اپنی تقریر جاری رکھی۔ لیکن جب آغا شورش کاشمیری نے تقریر شروع کی تو وہ بھلا یہ بے ہودگی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ برہمی کا اظہار کرتے ہوئے احرار رضا کاروں کو انہیں بھگانے کا حکم دیا۔ بس پھر کیا تھا میں اوپر چھت سے اس پٹائی کا نظارہ کر رہا تھا جو احرار رضا کاروں نے ان غنڈوں اور فتنہ برپا کرنے والے افراد کی کی۔

آغا صاحب کے بعد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر تھی۔ اس تقریر میں آپ نے پاکستان کے بارے ان خدشات کا اظہار کیا جو عموماً آپ اپنی ان دنوں کی تقاریر میں کیا کرتے تھے۔ یہ وہی خدشات تھے جو قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی قیادت نے اپنی ضد اور حماقت سے پورے کر کے دکھائے۔ جاری ہے

☆......☆......☆

© rasailojaraid.com